سیمینار

شہید ذوالفقار علی بھٹو

منعقدہ 5 جنوری 1995، لاڑکانہ

قومی کمیشن برائے تاریخ و ثقافت

اسلام آباد

SEMINAR

ON

SHAHEED ZULFIKAR ALI BHUTTO

January 5, 1995. LARKANA

National Commission on History and Culture
Islamabad.

Reproduced by:

Sani Hussain Panhwar

Member Sindh Council, PPP

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی تقریر

شہید ذوالفقار علی بھٹو کی عظیم پارٹی کے راہنما شہید بھٹو کے جانثار کارکنوں

السلام علیکم !

ہر سال کی طرح آج بھی ہم اپنے لیڈر اپنے محسن اور اپنے شہید کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں لیکن آج کا دن بہت مختلف ہے۔

ایک صدی اپنے آخری موڑ پر ہے صرف پانچ سال رہ گئے ہیں پھر 21 ویں صدی اپنے دامن میں کتنے ہی امکانات لے کر آنے والی ہے۔ اور صرف 2 سال رہ گئے ہیں جب پاکستان کو قائم ہوئے نصف صدی ہو جائے گی اور ہم پاکستانی اپنی گولڈن جوبلی منائیں گئے۔ خواتین و حضرات! آج ہم جس شخصیت کی یاد میں یہاں جمع ہوئے ہیں اس نے اپنی زندگی کے 51 برسوں میں سے 22 سال اپنے عظیم وطن کی خدمت کے لئے وقف کر دیئے تھے۔ عملی سیاسی زندگی میں داخل ہونے کے بعد سے لافانی زندگی میں داخل ہونے تک وہ پاکستان کے افق پر ایک ستارے کی طرح چمکتے رہے اور آج بھی وہ آسمانوں پر چمکتے ستاروں میں سے کسی ایک میں سے ہیں اور ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ یہ پاکستان کا گیارہواں سال تھا جب وہ حکومت پاکستان سے وابستہ ہوئے۔ انہوں نے ہر مرحلے پر پاکستان اور پاکستان کے عوام کی خدمت اس جذبے اور لگن سے کی کہ ملک بھر میں انہیں عزت اور شہرت حاصل ہوتی چلی گئی۔ وہ سیاسی اور سماجی افق پر چھاتے چلے گئے۔ وہ حکومت میں تھے یا اپوزیشن میں تھے وہ آزاد تھے جیل میں۔ دلوں میں حکومت انہی کی تھی۔ 1958 سے لے کر 1979 میں اپنی شہادت تک وہ پاکستان

کے ہر با شعور گھر کا موضوع سخن تھے۔ ہر زندہ دل کی دھڑکن تھے۔ انہیں جسمانی طور پر جدا ہوئے سولہ سال گزر گئے ہیں لیکن انہیں تختہ دار کے حوالے کرنے والے ظالموں نے کہاں سوچا ہوگا کہ جسمانی خاتمہ ایسی ہستیوں کا خاتمہ نہیں ہوتا۔

شہید ذوالفقار علی بھٹو آج بھی ہر باشعور ذہن کی روشنی ہیں۔ آج بھی سب زندہ دلوں کی دھڑکن ہیں۔ ان کے افکار ایک افق سے دوسرے افق تک پھیلتے رہتے ہیں۔ سال مہینے صدیاں ان کا راستہ نہیں روک سکتیں۔ کیونکہ بھٹو جیسے لیڈروں کی وقت ضرورت نہیں ہوتا بلکہ وہ لیڈر وقت کی ضرورت ہوتے ہیں۔ وقت کی خواہش ہوتی ہے کہ ایسے پھول کھلیں ایسے روشنی پھیلے۔ ماہ و سال خود اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ ایسی ہستیاں پیدا کر جو انسانوں کی عظمت کو برقرار رکھ سکیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی سب سے حسین مخلوق انسان کو پستی اور ذلت سے نکال کر ایسے عروج پر لے جائیں جہاں ستارے بھی اس سے لرزنے لگیں۔

میرے بھائیوں میرے ساتھیو !

میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میں ایسے عظیم اور تاریخ ساز شخصیت کے گھر میں پیدا ہوئی۔ اور میں شکر گزار ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی ہستی کے راستے پر چلنے کی توفیق دی۔ مجھے صرف یہ فخر نہیں کہ میں اس پاکستانی کی بیٹی ہوں۔ مجھے یہ فخر بھی ہے کہ پاکستان کے اس بہادر بیٹے کی طرح میں نے بھی آمریت کو للکارا۔ میں نے بھی جیلیں کاٹیں۔ میں نے بھی جدوجہد کی۔ مجھے بھی غریبوں ناداروں محنت کش خواتین اور دانشوروں کی محبت نصیب ہوئی۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کا دور اسی طرح رواں دواں ہے۔ یہ دور بے نظیر کا نہیں ذوالفقار علی بھٹو ہی کا دور ہے۔ یہ اقتدار بے نظیر کا نہیں ذوالفقار علی بھٹو کا ہی اقتدار ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے اور شہید چیئرمین بھی ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ حکمران وہ نہیں عوام ہیں۔ قائد وہ نہیں عوام ہیں۔ یہ حکومت پیپلزپارٹی کی نہیں عوام کی حکومت ہے۔ قانون کی حکمرانی اور امور مملکت میں عوام کی شرکت اور مشکل مسائل کے لئے عوام سے راہنمائی لینا شہید ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست تھی

اور زندگی کے ان بنیادی اصولوں کو وہ اپنی سیاست کی بنیاد سمجھتے تھے اور یہی اصول جمہوریت کی روح ہیں۔ جمہوریت ہی وہ قیمتی موتی ہے جس کی تلاش میں جسکے قیام کے لئے ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی زندگی کے قیمتی سال پاکستان کے دیہات اور شہروں کے گلی کوچوں میں جدو جہد کرتے گزار دیئے۔ وہ ایسے ایسے علاقوں میں گئے جہاں پہلے کوئی لیدر کوئی حکمران نہیں گیا تھا اور پھر جمہوریت کی خاطر ہی انہوں نے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ وہ جو تاریخ میں زندہ رہناچاہتے ہیں انہیں جب احساس ہوتا ہے کہ ان کی فانی زندگی کا تسلسل ان کے جسمانی و جود کی بقا' ان کے اصولوں کی برقراری میں اتنی مدد نہیں کر سکتے جتنی موثر ان کی جان کی قربانی کر سکتی ہے۔ تو ایسے لوگ اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ان کو موت میں ہی قوم کی حیات ہے۔ ان کی قربانی سے کروڑوں کو نئی زندگی ملے گی۔

میرے بھائیوں اور بہنو ! میرے عظیم والد آپ کے قائد تاریخ میں زندہ رہنے والے لوگوں میں سے تھے۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں تاریخ کے بجائے آمر کے ہاتھوں تباہ ہونا پسند کروں گا۔ آج وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ تاریخ کے بارے میں ان کا شعور کتنا روشن تھا۔ آج تاریخ اس عظیم شخصیت کو خود خراج پیش کر رہی ہے۔ تاریخ خود ان کے خاکے میں رنگ بھر رہی ہے۔ تاریخ کی گیلری میں لگا ہوا ان کا پورٹریٹ کتنی روشنی پھیلا رہا ہے۔ کروڑوں عقیدت مند اس پورٹریٹ سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک پاکستان میں دو سیاسی سوچیں رہی ہیں۔ بھٹو اور پی پی پی کی سوچ یا انٹی بھٹو اور انٹی پی پی پی کی سوچ۔ بھٹو کے حامی جمہوریت کے پرستار ہیں وہ حکومت میں آتے ہیں اور انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوں تو عوام انہیں ہر صورت میں حکومت کا حق دیتے ہیں۔ وہ حکومت میں نہ ہوں تو ہمیشہ عوام کے حقوق کے لئے جدو جہد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بھٹو کے مخالف جمہوریت کے مخالف ہیں روشنی کے دشمن ہیں۔ قانون کی حکمرانی کے قاتل ہیں۔ عوام کو امور مملکت سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی مارشل لاء کے دور میں حکومت میں شامل ہوتے ہیں

اور کبھی غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لے کر اقتدار پر قابض جماعت بن جاتے ہیں۔ اور کبھی دھاندلی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔ بھٹو کے حامی معاشرے کو تقسیم کرنے کے قائل نہیں۔ سب کے ساتھ انصاف چاہتے ہیں۔ لسانی امتیاز برقرار نہیں رکھتے۔ لوگوں کو فرقہ پرستی کی آگ میں نہیں جھونکتے۔ بھٹو کے مخالفیں عوام کو لڑوا کر اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ کبھی زبان کی بنیاد پر شر پھیلاتے ہیں اور کبھی مسلمانوں کو فرقوں میں بانٹ کر ایک دوسرے کا جانی دشمن بنانا چاہتے ہیں۔ کبھی انتشار کی تلوار چلاتے ہیں اور کبھی بنیاد پرستی کے اندھیرے پھیلاتے ہیں۔ شہید بھٹو پاکستان کی تاریخ میں جمہوریت کی حقیقی بنیاد رکھنے والے پہلے لیڈر ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے جن اصولوں کی بنیاد پر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو متحد کیا اور جن جمہوری روایات کے ساتھ پاکستان حاصل کیا' پاکستان کے قیام کے بعد پہلی بار انہی جمہوری اصولوں کی بنیاد پر قائد عوام نے پاکستان کے عوام کو متحد کیا۔ جمہوریت کی روح جمہور کی رائے تھے بھٹو سے پہلے پاکستان میں سیاست ڈرائنگ روم تک محدود رہتی تھی' لاہور' کراچی اور ڈھاکہ کے ڈرائنگ روم میں چند لوگ بیٹھ کر چائے کی پیالیاں پی کر کروڑوں پاکستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور ملک مزید مسائل سے گھر جاتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا ہم سیاست کو ڈرائنگ روم سے نکال کے عوامی گلیوں میں لے جائیں گے۔ ملک کے مالک عوام ہیں فیصلہ کرنے کا حق بھی صرف عوام کو ہے۔ پاکستان میں پہلی مرتبہ عوام کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ پاکستان کے ہر فرد نے پہلے بار اپنی قدر محسوس کی۔ انسان کی عظمت کا پاکستان میں پہلی مرتبہ اعتراف کیا گیا۔ پاکستان کے حکمران طبقے' جاگیردار' سرمایہ دار' مذہبی ٹھیکے دار' بھٹو کے مخالف کیوں ہوئے؟ صرف اس لئے کہ اس نے غریبوں کو بیدار کیا۔ مجرموں کو خبردار کر دیا۔ ناداروں کو اہمیت دی۔ مظلوموں کو زبان دی۔ پاکستان کے سیاستدان انسانوں کو جانوروں کی طرح ہانکنے کے عادی تھے۔ اپنے سامنے کسی کو بولتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اب مزدور سرمایہ دار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنے لگا ہے۔ ہاری وڈیرے کے سامنے سر نہیں

جھکا رہا ہے۔ پاکستان کو عظمت نصیب ہوئی۔ وقار میسر آیا۔ ہم نے بھارت سے جنگی قیدی واپس لئے۔ ہم نے مغربی بازو سے اپنے مقبوضہ علاقے دشمن سے واپس لئے۔ شاہراہ قراقرم تعمیر کی۔ ہم نے اسلحہ ساز فیکٹریاں بنائیں۔ ہم نے فرد کو آزاد کیا اور عزت نفس پیدا کی۔ ہم نے NUCLEAR پروگرام شروع کئے 1973ء کا آئین دیا۔ ہم نے ایک Woman Vice Chancellor اور ایکWoman Governer تعینات کر کے فضا کو اتنا تبدیل کیا کہ آج ملک کے اندر اور دنیا میں پہلی منتخب وزیراعظم ایک خاتون بنی۔ یہ ترقی پسند فیصلے شہید بھٹو ہی کی اصلاحی سوچ کا نتیجہ تھے۔ 20 دسمبر 1971 سے 4 جولائی 1977 تک کتنا مختصر سا دور ہے۔ اس کے بعد پلوں کے نیچے سے کتنا پانی گزر چکا ہے۔ وہ عرصہ ساڑھے پانچ سال تھا۔ اس کے بعد تیرہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ تقریباً" تین گنا عرصہ گزر چکا ہے۔ آج بھی پاکستانی اسی دور کو یاد کرتے ہیں جب سفارت' معیشت اور سیاست میں نئے سنہری باب قلمبند کئے گئے۔ پاکستان میں طویل آمریت کے بعد شروع ہونے والا جمہوریت کا یہ سفر ایک رات اچانک کیا۔ جبر کی رات مسلط کی گئی۔ عوام کو اپنی منتخب حکومت سے محروم کر دیا گیا۔ وہ سب حسین خواب بکھر کر رہ گئے جو 12 کروڑ پاکستانیوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے دوسرے دور حکومت کے لئے دیکھے تھے۔ جن کی تعمیر میں ان کی زندگی تھی۔ 11 سال تک ایک ظالم آمر ایک جابر ڈکٹیٹر عوام کے خلاف پاکستانیوں کی امنگیں ملیا میٹ کرتا رہا۔ جمہوریت کے مخالفین ڈکٹیٹر سے Concession حاصل کرنے کے لئے منافقت اور جھوٹ کا کاروبار کرتے رہے۔ ملک دنیا بھر میں رسوا ہوتا رہا۔ پاکستان میں جہالت کے اندھیرے پھیلتے رہے۔ فرقہ پرستی کی لعنت پھیلائی گئی۔ لسانیت کی بنیاد پر پاکستانیوں کو تقسیم کیا گیا۔ کونے کونے میں منشیات' ہیروئین کا زہر پھیلتا رہا۔ پورے ملک میں غیر قانونی اسلحہ تقسیم ہوتا رہا۔ لیکن اپنے محبوب قائد کی شہادت کو عوام نے اپنا غم نہیں بننے دیا۔ اسے اپنی طاقت میں تبدیل کیا۔ اور اس پرچم کو بلند کر کے وہ پورے ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔ آمر کے کارندوں نے کون سا ظلم

نہیں دکھایا کون سا ہتھکنڈہ اختیار نہیں کیا۔ اس وقت انسانی حقوق کسی کو یاد نہیں تھے۔ اس وقت انصاف جس بے جا آئین اور قانون سب فراموش ہو چکے تھے۔ آج جو جمہوریت کے علمبردار بنے ہوتے ہیں۔ آئین اور قانون کی کتابوں کے حوالے دیتے ہیں۔ اس وقت وہ صرف اور صرف ڈکٹیٹر کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اس وقت وہ سب ڈکٹیٹر کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ وہ دن کو رات کہتے تھے۔ اور رات کو دن۔ اس وقت صرف ذوالفقار علی بھٹو کی آواز موت کی کوٹھڑی سے بلند ہوتی رہی۔ خون کے پیاسوں نے جمہوریت کے سالار کو پاکستان کے عوام سے چھین لیا لیکن اس کی آواز اسی طرح بلند ہوتی تھی۔ خون کے پیاسوں نے جمہوریت کے سالار کو پاکستان کے عوام سے چھین لیا لیکن اس کی آواز اسی طرح بلند ہوتی رہی۔ پاکستان کے عوام نے پاکستان پیپلز پارٹی کے بہادر کارکنوں نے جمہوریت کی شمع کو روشن رکھا اور بالاخر جمہوریت کی صبح طلوع ہو کر رہی۔ آج اگر ملک میں جمہوریت کی ہوائیں چل رہی ہیں اور تحریر و تقریر کی آزادی ہے، جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں، سینٹ اور قومی اسمبلی میں عوام کے منتخب نمائندے قانون بنا رہے ہیں ملکی اور بیرونی سطح پر کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں، صوبوں میں اسمبلیاں اور منتخب نمائندے قانون بنا رہے ہیں، اقتدار اعلیٰ کے فیصلے کر رہے ہیں۔ عدلیہ آزاد ہے ججوں پر کسی نئے حلف کی پابندی عائد نہیں کی جاتی، اخبارات جو چاہیں لکھتے ہیں اور شائع کرتے ہیں تو یہ سب کچھ ہمارے عظیم قائد کی مسلسل جدو جہد اور عظیم قربانی کا نتیجہ ہے اور ان ہزاروں کارکنوں کی قربانی کا ثمر ہے جنہوں نے زندگی کے چمکتے دن جیل کی تاریک کوٹھڑی میں گزار دیئے

بھائیو اور بہنو !

شہید ذوالفقار علی بھٹو جمہوریت کو ایک ایسا نغمہ قرار دیتے تھے جو انقلابیوں کی روح کو ہر وقت سرشار رکھتا ہے۔ جو تیسری دنیا کے انسانوں کے لیے سب سے بہتر نظام حکومت مہیا کرتا ہے۔ ہماری پارٹی کے بانی چیئرمین نے جمہوریت کو ضرور تھیوری میں ہی نہیں علمی طور پر پیش کر کے دکھایا۔ جس کا سب سے ٹھوس ثبوت 1973ء کا

متفقہ طور پر منظور شدہ آئین ہے جو آج 21 سال بعد بھی اس مملکت کی مقدس دستاویز ہے۔ پہلے تو ہمارے ہاں برسوں آئین بن نہیں سکا تھا۔ بنا تو دو سال میں ختم ہوگیا۔ مارشل لاء کے خلاف جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں ہمیں 1988ء میں آپ نے حکومت دی' دھاندلی سے بر سر اقتدر آنے والی حکومت کے خلاف آئینی جدوجہد کے تحت عوام نے ہمیں 1993ء میں پھر حکومت کرنے کا حق دیا۔ اب ہمارے سامنے دوسری قسم کی آزمائش ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ اب احتجاجی سیاست کا دور نہیں رہا۔

اب عوام ہم سے بہترین Administration مانگتے ہیں۔ معاشرے سے انحطاط اور ذہنی پستیوں کو دور کرنا اب جمہوریت پسندوں کا فرض ہے۔ ملک سے لسانی تقسیم فرقہ وارانہ کشیدگی دور کرنا Terrorism کو جڑ سے اکھاڑنا اب جمہوری جدوجہد کا حصہ ہیں۔ عوام میں تعلیم کی اشاعت۔ ملک میں علاج کی سہولتیں فراہم کرنا' اب جمہوری عمل ہے۔ معاشرے سے کلاشنکوف اور ہیروئین کو ختم کرنا اب جمہوریت ہے۔ ایسا پاکستان قائم کرنا جو نہ صرف فوجی طور پر طاقتور ہو بلکہ اخلاقی اعتبار سے بھی مضبوط ہو۔ جہاں دولت بھی ہو دانشور بھی ہوں حکومت بھی ہو اور اس پر نکتہ چینی بھی ہوسکے۔ ایسا پاکستان جہاں جلال بھی ہو' جمال بھی ہو۔ جہاں ہمارے حسین قدرتی ماحول کو تحفظ ملے۔ ایسا پاکستان جو اقتصادی طور پر بھی طاقت ور ہو۔ شہید ذوالفقار علی بھٹو کی فکر آج بھی تابندہ ہے۔ پاکستان نے ان کی قیادت میں تیسری دنیا اور علام اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل کی تھی۔ آج ان کے نظریہ جمہوریت پر عمل کر کے ہم نے نئے ابھرتے ہوئے عالمی نظام میں اپنے Geographical پوزیشن کی وجہ سے اپنی حیثیت کو تسلیم کرانا ہے۔ ایک طرف جنوبی ایشیا کے عوام دوسری طرف خلیج اور تیسری طرف وسطی ایشیا سب ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ ہمارے پاس سیاسی تجربہ بھی ہے اور قیادت بھی۔ وسائل بھی ہیں اور ہمارے عوام ذہنی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں۔ قائد عوام ذوالفقار علی بھٹو نے عالم اسلام کو متحد کرنے کے لیے Summit

Islamic منعقد کی تھی۔ انشاء اللہ ہم اس کے خواب کی تعبیر حاصل کر کے رہیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ پی پی پی کا ہر کارکن اور شہید ذوالفقار علی بھٹو کا ہر پرستار اس مشن میں میرا طاقتور بازو بنے گا۔

اللہ سے ہم دعا گو ہیں عوام ہمارے ہم سفر ہیں۔ منزل ہمارے سامنے ہے۔ ایک روشن مستقبل ہمارا منتظر ہے۔ شکریہ۔

جئے بھٹو _ سدا جئے۔

احمد فراز

پہلے ہم آمریت کے خلاف لکھتے رہے پھر جمہوریت کے حق کے لئے اور اب جمہوریت کو بچانے کے لئے۔ کراچی کے حوالے سے ایک نظم ہے میری۔

میرے سارے لوگو !

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ بندوق ہے جو
اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی ہے
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری رگ رگ کا لہو چاٹ چکی ہے
پھر مرے شہر میں بارود کی بو پھیلی ہے
پھر سے تو کون ہے میں کون ہوں آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میان من و تو پھیلی ہے
پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا
پھر ہوئیں عام وہی اہل ریا کی باتیں
نعرہ حب وطن مال تجارت کی طرح
جنس ارزاں کی طرح دین خدا کی باتیں
اس سے پہلے بھی تو ایسی ہی گھڑی آئی تھی

صبح وحشت کی طرح، شام غریباں کی طرح
اس سے پہلے بھی تو پیمان وفا ٹوٹے تھے
شیشہ دل کی طرح آئینہ جاں کی طرح
پھر کہاں احمریں ہونٹوں پہ دعاوں کے دیئے
پھر کہاں شبنمی چہروں پہ رفاقت کی ردا
صندلیں پاؤں سے مستانہ روی روٹھ گئی
مرمریں ہاتھوں میں جل بجھ گیا انگار حنا
دل نشین آنکھوں میں فرقت زدہ کاجل رویا
شاخ بازو کی لئے زلف کا بادل رویا
مثل پیراہن گل پھر سے بدن چاک ہوئے
جیسے اپنوں کی کمانوں میں ہوں اظہار کے تیر
اس سے پہلے بھی ہوا چاند محبت کا دو نیم
نوک دشنہ سے کھنچی تھی مری دھرتی پہ لکیر
آج ایسا نہیں ایسا نہیں ہونے دینا
اے مرے سوختہ دانوں مرے پیارے لوگو
اب کہ گر زلزلہ آئے تو قیامت ہوگی
مرے دلگیر اور درد کے مارے لوگو!
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لئے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو!

ڈاکٹر انور سجاد

ذوالفقار علی بھٹو اور جمہوریت

قسم ہے رب العلمین کی کہ جب
انسان کو سیدھا راستہ دکھائی نہ دے
اور وہ ظلم کی نشان دہی نہ کر سکے
اور ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے
اور جب
لاتعلقی انسان کا شیوہ بن جائے
اور وہ اپنے فیصلے دوسروں پر چھوڑ دے
زندگی بیکار معلوم ہو اور دل مردہ وہ جائے
انسان خود ایک طرف ہو کر بیٹھ رہے
اور دوسروں سے عمل کی توقع رکھے
اور جب
حقیقت سے آنکھیں بند کر لی جائیں
تاریخ سے عبرت نہ پکڑی جائے
جہالت کے اندھیرے پھیل جائیں
بصیرت ماند پڑ جائے
عالم علم کا سودا کرے
اور تخلیق کے سوتے خشک ہو جائیں

تو یقیناً" انسان اپنی راہ سے بھٹک چکا ہے

اور جب

رزق کے وسائل عام نہ ہوں

امیر' امیر تر ہوتے چلے جائیں

زمیندار کسان کا حق لے جائے

سرمایہ دار مزدور کا حق چھین لے

سرمایہ محنت پر غالب آجائے

قومی دولت پر چند لوگوں کا قبضہ ہو

اور عوام زندگی کی ضروریات کو ترسیں

اور جب

انصاف کی راہیں لمبی ہو جائیں

غاصبوں کی رسی دراز ہو

مظلوموں کی فریاد اسی کا یقین نہ ہو

دولت اور اقتدار انصاف کے راستے میں حائل ہو جائیں

تو یقیناً"' انسان سخت خسارے میں پڑ چکا ہے

اور جب

بے اصولی اصول بن جائے

دیانت داری مشکلات میں اضافہ کرے

شرافت انسانی کمزوری شمار ہو

خوشامد دانشمندی کی معراج ٹھہرے

منافقت قومی مزاج بن جائے

اور جب

ریاست کی احساس دین پر نہ ہو

ریاست کی نظریاتی بنیادیں نظر انداز کر دی جائیں
ریاست کے معاملات باہم مشورے سے طے نہ پائیں
شہری آزادیاں نایاب ہوں
لوگوں کی رضا حکومت کو بدلنے پر قادر نہ ہو
اور قوی تقاضوں پر بیرونی دباو حاوی ہو جائے
اور جب
معاشی اور معاشرتی ناہمواریاں ظلم کا منبع بن جائیں
عوام میں اتحاد اور تنظیم نہ ہو
تو یقیناً" معاشرہ کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں
اور جب
انسان اپنی راہ سے بھٹک چکا ہو
اور سخت خسارے میں پڑ چکا ہو
اور معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں
تو ان لوگوں کے لئے
جو مظلوم ہیں
جو نوجوان ہیں
جو عوام کے اتحاد کے لئے کوشاں ہیں
جہاد کی راہ ہی سیدھی راہ ہے
جہاد نام ہے اس ابدی جدوجہد کا
جس میں انسان اپنی تخلیقی صلاحیتیں اور زور بازو سے انسانی اقدار کی حفاظت کرے اور
اپنے عروج کی منزلیں طے کرتا جائے
جہاد نام ہے عوام کے اس اتحاد کا
جو مصنوعی امتیازات مٹا کر تقوے کو انسانی شرف کا معیار ٹھرائے

جہاد نام ہے ایسا معاشرہ قائم کرنے کا
جس میں خدا کی حاکمیت کا اقرار کیا جائے
دین، زندگی کی سب سے بڑی اخلاقی قوت ہو
بھلائی کے فروغ اور برائی کے تدارک کا سامان ہو
کوئی مظلوم اور محکوم نہ رہے
حریت، اخوت اور مساوات کے اصول جاری و ساری ہوں
انسان بھرپور زندگی گزار سکے
اور دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو
جہاد نام ہے ایسا نظام حکومت قائم کرنے کا
جس میں عوام کی بنیادی ضروریات پوری کی جائیں
بنیادی انسانی حقوق محفوظ ہوں
انسانی ہمت کو قوی دولت کی اساس سمجھا جائے
فرد کی عزت نفس کا احترام ہو
تشدد کے بجائے تعلیم قائل کرنے کا ذریعہ ہو
مرد اور عورت کو ترقی کے یکساں مواقع میسر ہوں
قانون کی علمداری ہو، اور جمہوریت سربلند ہو
جہاد نام ہے حق کے لئے سینہ سپر ہونے اور ظلم کے خلاف شہادت دینے کا
جہاد نام ہے اس ہمہ گیر تیاری کا جو ملک اور قوم کو ناقابل تسخیر بنا دے
جس کے باعث دشمنوں کے دل ہیبت سے لرزتے ہوں
اور جس سے دنیا بھر کے مظلوموں اور محکوموں کو تقویت ملتی ہو
اس لیے ہم سب عوام
کسان، مزدور، سپاہی، کاریگر، دکاندار، دفتری، کارکن، طالب علم، استاد، دانشور، مرد اور
عورت عوام کے اتحاد کا اعلان کرتے رہیں گے

جہالت کے خلاف اور علم کے حق میں
منافقت کے خلاف اور دیانت کے حق میں
ظلم کے خلاف اور انصاف کے حق میں
غلامی کے خلاف اور آزادی کے حق میں
ہم جہاد کریں گے' اپنی جان سے' مال سے' زبان سے' قلم سے
ہم جہاد کریں گے---- یہاں تک کہ
خدا کی زمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے۔

یہ ایک انگریز کی نثری نظم کا ترجمہ ہے جو یونس ادیب نے کیا تھا۔ آپ کو شاید یاد ہو' بھٹو صاحب کی یہ تحریر اس پمفلٹ کے آخری صفحے پر چھپی تھی جو لاہور میں 30 نومبر والے پہلے' پیپلز پارٹی کے کنونشن میں تقسیم کیا گیا تھا۔

بھٹو صاحب کچھ ایسے ہی شاعر' شاعرانہ سیاست دان اور شاعرانہ سیاسی فلسفی تھے۔ جب سیاستدان اور فلسفی شاعرانہ مزاج رکھتا ہو اور ماضی پر گرفت کے باعث جس کے سامنے مستقبل' حال کی طرح منکشف ہو' اسے ویژنری کہا جاتا ہے۔ اس ویژنری کی اس نظم میں' ان کی قلبی واردات ان کے دل کا گداز' زندگی کے بارے میں ان کا رویہ اور ان کی سوچ کا مکمل جوہر سمٹ آیا ہے۔ یہ نظم قرارداد مقاصد ہے اور پی پی کے منشور کا بیج بھی' اور اسی سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ بھٹو صاحب حصول مقاصد کے لئے تشدد تصادم کی بجائے جمہوریت کے راستے کو یوں ترجیح دیتے تھے کہ بھٹو اور جمہوریت کے باطنی معنی ایک ہی نظر آتے ہیں۔

آپ جانتے ہیں کہ جاگیردارنہ نظام اپنے بطن میں کتنا جبر' کتنا استحصال اور کتنی قدامت پسندی لئے ہوتا ہے۔ برکلے یونیورسٹی کے زمانے میں پیلو مودی کا خیال تھا کہ انہوں نے سوشلزم اور سوشل جمہوری نظام کا نظریہ کتابوں اور پروفیسر کے لیکچروں سے متاثر ہو کر اپنایا ہے۔ لیکن بھٹو صاحب نے سختی سے اس کی نفی کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ان ہاریوں کے باعث سوشلزم کے قریب آئے ہیں جنہیں انہوں نے عین انتہائی

اگرچہ ہم میں سے بیشتر لوگوں کی سیاسی یادداشت کوئی اتنی پختہ نہیں ہوتی پھر بھی آپ کو یاد ہوگا کہ غلام محمد سے لے کر ایوب خانی دور تک جمہوریت کو کیسے کیسے ریپ کیا گیا تھا قائد اعظم کی عطا کردہ جمہوریت کی تصویر آکسیجن ٹینٹ میں پڑی تھی اور اس وقت کے نام نہاد جمہوریت پرست جو آج کے ضیاء الحق کی آمریت کے جنے جمہوریت پرستوں کی طرح غلام محمد' اور ایوب خان کے جنے تھے' اس آکسیجن ٹینٹ ہی کو اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے' کہ بھٹو صاحب سیاسی افق پر طلوع ہوئے۔ بھٹو صاحب نے تاریخ کی پکار پر لبیک کہا کہ وہ پاکستان کے عوام کی پاکستان کی تاریخ کی ضرورت تھے' جس طرح قائد اعظم ہندی مسلمانوں کی تاریخی ضرورت تھے۔

بھٹو صاحب نے سکندر مرزا کے زمانے میں نیول حدود کے سلسلے میں پاکستان کی کامیاب نمائندگی کرنے سے لے کر تاشقند تک نہ صرف اپنی خدمات ہر حکومت کو پیش کیں بلکہ ان کا ذاتی اعتماد بھی حاصل کیا تاکہ پاکستان کیب قا اور اس کے سنہرے مستقبل میں بھرپور حصہ لے سکیں' ایوب کے زمانے میں انتہائی مخالفت کے باوجود تاریخ ساز اصلاحات بھی کرائیں' لیکن بلااخر ان دیوتاؤں کے پر بھی مٹی کے ثابت ہوئے۔

پاکستان کے حاکموں اور حاکم طبقوں کے حوالے سے وہ جتنا سبق حاصل کر سکتے تھے کیا۔ بلااخر جب یہ احساس قوی ہو گیا کہ اب اپنی CONVICTIONS کے خلاف ان قوتوں کا مزید ساتھ دینا نا ممکن ہو گیا ہے اور ان کی اصلاح کی اب کوئی گنجائش نہیں تو ان جابروں سے پیچھا چھڑا کر' کہ ان کا مزید ساتھ دینا قومی منافقت اور مفاد پرست بددیانتی کے مترادف ہوتا' انہوں نے عوام کی خاطر' عوام ہی کو ساتھ لے کر چلنے کا جمہوری راستہ اپنایا' جو کہ قائد اعظم کا راستہ تھا اور پھر ان کی جدوجہد' فکر اور عمل سے ثابت ہوا کہ وہ قائد اعظم کے صحیح جانشین اور ان کی LEGACY کے جائز وارث تھے۔

ایوب آمریت کے خلاف بھٹو صاحب اور پی پی پی اور کروڑوں عوام کی جدوجہد

غربت، بھوک، افلاس اور لاچاری کی زندگی بسر کرتے دیکھا تھا۔ پھر ایک وقت میں یہ کہا تھا کہ

"I AM A SOC IALIST BY CONVICTION."

بھٹو صاحب کے مخالفین نے روز اول ہی سے انہیں متنازع بنانے کی کوشش کر دی تھی۔ انہوں نے ان کے خلاف ایک مضبوط متحدہ محاذ بنایا، تمام ذرائع ابلاغ پر ان کا قبضہ تھا، ان کے اقتدار کے دوران بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ادھر مداح انہیں مافوق البشر کی حیثیت دیتے رہے۔ بھٹو صاحب کے بعد قریباً" دو نسلیں گزر گئی ہیں، فخر زمان صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پاکستان کی تاریخ کو قطعی طور پر غیر متعصب تاریخ دانوں سے انتہائی معروضی انداز میں دوبارہ لکھوائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ وہ قائد اعظم اور قائد عوام کی جدو جہد اور اقتدار کا تفصیلی اور گہرا تجزیاتی مطالعہ کرائیں گے تاکہ پاکستانیوں کو، خاص طور پر گذشتہ دو نسلوں کو، اپنے دو عظیم محسنوں کو صحیح تناظر میں جاننے کا موقع ملے۔ وہ ان کے بنائے ہوئے راستوں پر ایک بار پھر پورے ایقان کے ساتھ چل کر ایک عظیم پاکستان کی تشکیل کر سکیں جس کی آج سے زیادہ کبھی ضرورت نہیں تھی۔

اگر پاکستان پیپلز پارٹی ہی بھٹو صاحب کی شخصیت اور ان کے نظریات کے پرچار کی پوری ذمہ داری اٹھا لیتی تو ہماری نوجوان نسلیں کم از کم یہ تو جان لیتیں کہ بھٹو صاحب کتنی باوقار، پر کشش شخصیت تھے۔ ان کے شائستہ آداب محفل، بڑے چھوٹوں سے حسن سلوک، دوستوں کے ساتھ محبت اور شفقت اور دشمنوں کے ساتھ فراخ دلی اور قومی بین الاقوامی معاملات میں ان کا تدبر، جرات، بے باکی، سوشل جمہوریت پر ان کا ایقان، دنیا بھر کے مظلوم اور مجبور مقہور انسانون کا ساتھ اور استحصالی قوتوں کے ساتھ نفرت اور دشمنی، دنیا بھر کے عظیم ہم عصروں نے کس کس انداز میں انہیں فراج تحسین پیش نہیں کیا۔ برٹرینڈ رسل تو ان کے گرویدہ تھے، اور ان کے قتل کے بعد نیا بھر کی مظلوم قوموں نے کتنے آنسو نہیں بہائے۔

تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ عوام اپنے دکھوں اور اذیتوں سے آشنا تو تھے لیکن بھٹو صاحب کے وسیلے سے انہوں نے اس کے وجوہات سے شناسائی حاصل کی۔ عوام میں سیاسی AWARENESS بھٹو صاحب ہی کی عطا ہے۔ ایوب آمریت نے غنڈہ گردی سے لے کر کردار کشی تک، بھٹو صاحب اور ان کے کروڑوں ساتھیوں کو کس کس طرح براہ راست تصادم پر مجبور نہیں کیا، کس کس طرح سیل جمہور کے سامنے بند باندھنے کو کوشش نہیں کی تھی لیکن بھٹو صاحب نے عوام اور ان کی انقلاب کو اپنی فراست کے باعث اور جمہوریت کا طویل اور صبر آزما راستہ اختیار کر کے اپنی تحریک کو بچا لیا کہ معروضی حالات اس قسم کے طالع آزما انقلاب کے حق میں نہ تھے اور نہ جابر قوتیں چاہتی تھیں کہ تصادم میں سب کچھ ختم کر دیا جائے۔

اگرچہ 30 مارچ 1956 کو پاکستان کو اسلامی جمہوریت قرار دیا گیا تھا لیکن پاکستان جمہوری تھا نہ اسلامی _ بھٹو صاحب کا ایمان اللہ تعالیٰ، اس کے نبی آخر الزمان ﷺ اور کلام پاک اپر ایمان پختہ تھا اور قائد اعظم کے شعور کے حامل تھے، اس لئے پی پی پی کے منشور کی بنیاد اسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری حیثیت ہے اور طاقت کا سر چشمہ عوام ہیں۔ یعنی مساوات محمدی ﷺ کے جوہر پر استور کی تھی، جو پاکستان کے تہذیبی، تاریخی اور دینی پس منظر کا آئینہ تھا۔ ایوب خان نے تمام مفاد پرست طبقوں، انتہائی رجعت پسند سیاست دانوں اور ان ہی کے قبیل کی نام نہاد مذہبی جماعتوں کو مساوات محمدی ﷺ کے داعی کے خلاف صف آرا کیا، لیکن یہ لوگ عوام کا اعتماد کھو چکے تھے اور سیاسی طور پر بھٹو صاحب کی بیعت کر چکے تھے۔ پھر دنیا نے دیکھا کہ کس طرح سیل جمہوریت نے اپنے قائد کی قیادت میں آمریت کے تمام بند توڑ ڈالے۔

جب اقتدار بھٹو صاحب کے حوالے کیا گیا تو سرکار سیدنا علی کی بات یاد آئی جو انہوں نے خلافت قبول کرتے وقت کہی تھی۔ کہ خلافت تو اس وقت مہمیز کیا ہوا اونٹ ہے جس پر مجھے سوار کر دیا گیا ہے۔

فریب زدہ شکست خوردہ اور حوصلہ ہاری قوم' جو مشرقی حصہ کھو دینے کے بعد
حساس منزل سے بھی محروم ہو چکی تھی' خزانہ خالی' پامال شدہ دفاع' کچے دھاگے سے
ندھا وطن کا مستقبل۔ یحییٰ خان نے انہیں اقتدار نہیں بلکہ وہ ندامت منتقل کرنے کی
کوشش کی تھی جو اس کی حماقتوں اور ہوس اقتدار کے باعث اس کا حصہ ٹھہری تھی۔
لیکن بھٹو صاحب نے احساس ذمہ داری کے باعث یہ ذمہ داری بھی قبول کی اور اس
ندامت کو وقار میں بدل دیا کہ ان کا ایمان تھا کہ صرف عوام کی قوت ہی وطن عزیز کو
بچا سکتی ہے اور عوام کو بھی ان کے سوا کسی پر بھروسہ نہ تھا۔

بھٹو صاحب نے پارٹی منشور پر عمل درآمد کرنا شروع کیا تو انہیں کیسی کیسی
مزاحمتوں کا سامنا نہیں کرنا۔ پڑا رجعت پسند حاکم طبقے تو کھلی دشمنی پر اتر ہی آئے تھے
لیکن حسابی کتابی قسم کے انتہا پسند بائیں بازو والے بھی بے صبری کا مظاہرہ کرنے پر تل
گئے تھے۔ جمہوریت کے ذریعے معاشرے کو منقلب کرنے کا عمل' خاص طور پر
سوشلسٹ اسلامی جمہوریہ میں منقلب کرنے کا عمل طویل اور صبر آزما ہوتا ہے۔

دراصل جاگیرداری اور جمہوریت' اپنی باہمی مخاصمت کی وجہ سے کبھی ساتھ نہیں
چل سکتے۔ اور پھر سوشل جمہوریت! اور پھر نیم سرمایہ دارانہ نیم جاگیر دار سماج میں
جمہوریت' درحقیقت اکثریت پر اقلیت کی حکمرانی کا نام ہوتا ہے جس میں دولت اپنا
اقتدار قائم کرتی ہے۔ ایسی جمہوریت میں پارلیمنٹ کے آقا' صنعت کار' جاگیردار' بینکوں
کے مالک اور ان لوگوں کے گماشتے ہوتے ہیں۔ اس نوع کی جمہوریت پسے ہوئے عوام
یعنی جمہور کے استحصال کا ایک ہتھیار ہوتا ہے۔ اس لئے بھٹو صاحب کے خلاف جاگیر
دار' سرمایہ دار اور ان کے گماشتہ بیوروکریٹس نے رفتہ رفتہ بھٹو صاحب کے خلاف بننا
شروع کر دیا' اگر بھٹو صاحب ان کا لوٹ کھسوٹ کا نظام برقرار رکھتے تو یہی لوگ ان کی
تاریخ گواہ ہے کہ بھٹو صاحب کو بھی آمر مطلق بنانے میں گریز نہ کرتے۔

آپ جانتے ہیں کہ جمہوریت اور حزب اقتدار اور آپوزیشن کا دو طرفہ معاملہ ہوتا
ہے اور اسی حوالے سے آپوزیشن کی صحت مند تنقید جمہوری حکومت کو راہ راست پر

رکھتی ہے۔ بھٹو صاحب اسی سیاسی اصول کے قائل تھے لیکن مفاد پرست ٹولے نے ایک بار پھر جمہوریت کے خود ساختہ تصور کی آڑ میں ملک کو اسی سیاسی انتشار اور علاقی سازشوں کی آماجگاہ بنا کر اپنے ذاتی اور طباقتی مفادات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ بھٹو صاحب نے عوام کی جمہوری طاقت اور اپنی فراست سے ان کے عزائم کو پروان نہ چڑھنے دیا اور یوں سازشی ان کے جانی دشمن بن گئے _ کوئی اور ملک ہوتا تو ایسے بھیانک' مجرمانہ اور شرمناک کردار کے حامل سیاست دانوں کو جمہور کی قوت سے سیاسی زندگی سے جبراً" ریٹائر کر دیتے۔ لیکن جمہوری مزاج کی مجبوری کے تحت انہوں نے ان کے ماضی کو فراموش کر کے انہیں قومی زندگی میں از سر نو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا اور انہیں اپنا جمہوری کردار ادا کرنے کی مخصوص فضا فراہم کی۔ بھٹو صاحب کو بہت قلق تھا کہ انہیں معیاری آپوزیشن میسر نہ آسکی جو منظم ہو' جمہوری اقدار کہ حامل ہو اور قومی مفادات پر ذاتی مفادات کو قربان کر دے۔ بھٹو صاحب جمہوریت ہی کے باوصف اپنے فیصلوں میں رائے عامہ کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اپنے وہ موقف جن کے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ ان پر قائم رہنا ملکی اور قومی مفاد میں ضروری ہے' ان سے وہ کبھی نہیں ہٹے تھے۔ ہٹ دھرمی کے بجائے وہ ایک خصوصی حکمت عملی مرتب کرتے جس میں رائے عامہ کی تربیت کی جاتی مسائل کے تمام مثبت منفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے' پھر موزوں وقت کا انتظار کرتے کہ جب جذبات کی دھند چھٹ جاتی اور عقل صحیح فیصلے کرنے کی اہل ہو جاتی تو قوم ان کا موقف قبول کرلتی۔ بنگلہ دیش منظور' نامنظور کے مسئلے کا حل' اس کی روشن مثال ہے۔

منشور کے مطابق بتدریج اصلاحات کے ساتھ ساتھ ان کا پہلا قدم جمہوری قدم مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے طوق کو پہلے ہی موقع پر اتار پھینکنا تھا اور عظیم ترین قدم قوم کو ٹھوس بنیادوں پر استوار ایک مضبوط اور قومی امنگوں سے مکمل طور پر ہم آہنگ اور کامل طور پر متفقہ آئین دینا تھا۔

پاکستان اپنے محبوب قائد کی سربراہی میں ایک صحیح اور مکمل اسلامی سوشلسٹ

جمہوریہ بننے کی منزل کی طرف رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ خارجہ پالیسی عزت نفس' برابری اور دو طرفہ تعلقات پر مبنی ' تاریخی اور معروضی تقاضوں کے مطابق مسلم ممالک اور تیسری دنیا کی پرخلوص' باوقار رفاقت' سامراجی دنیا کے مد مقابل آجانا' بڑے اعتماد اور جرات کا کام تھا۔ بھٹو صاحب کے خلاف سامراجی اور ان کے گماشتوں کی سازش کا جال تیزی سے بنا جانے لگا' جس سے بھٹو صاحب اپنے ساتھ اقتدار میں شامل عوام کو باخبر رکھتے تھے۔ لیکن سامراج کی بے صبری اور ماہرانہ سازشیں رنگ لائیں۔ صادق اور جعفر کی برصغیر کی روایت میں صادق اور جعفر کا مرکب چنا گیا' جس نے ایک عظیم عوامی راہنما کے ہاتھوں سے بندوق کے بل پر' قوم کا سنہرا مستقبل چھین کر تاریکیوں میں اتار دیا۔ اور جمہوریت کا وہ پودا جسے کروڑوں عوام نے مل کر لگایا تھا اور جس کی اتنی محنت اور جانفشانی سے آبیاری کی جا رہی تھی' فل بوٹوں تلے روند دیا گیا۔ انڈس ہائی وے' اسلامی بم' اسلامی بینک' قومی عزت نفس' جاگیرداری سرمایہ داری کا خاتمہ' سوشل ڈیموکریسی' تیسری دنیا سے اتحاد۔ بھٹو کی ان سب باتوں سے مغربی سامراج کو بغاوت کی بو آنے لگی۔ سامراج اور اس کے گماشتوں کے لئے بھٹو کا قتل واجب ہو گیا۔ اور شہادت بھٹو صاحب کا مقدر بن گئی۔

مجھے ذاتی طور پر ہیرو شپ سے کبھی دلچسپی نہیں رہی' لیکن ہیرو شاید انسانی زندگی میں چاہے وہ انفرادی ہو یا اجتماعی کسی نہ کسی خلا کو تو پر کرتا ہی ہوگا کہ جس کے وسیلے سے فرد اور قومیں اپنی تکمیل کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

انسان دراصل اس وقت مرتا ہے جب اسے اور اس کی باتوں کو بھلا دیا جاتا ہے اور عظیم قومی راہنما کو اس وقت زمین کے ساتویں پردے میں منتقل کر دیا جاتا ہے جب اس کر فکر لپ سروس تک محدود ہو جائے۔ اقبال اور قائد اعظم کے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ بھٹو صاحب بھی تو اسی قبیل کے ہیں اور لوگ بھی وہی جو اپنے عظیم راہنماوں کے گورکن بنتے جاتے ہیں۔ میں بہت رجائیت پسند ہوں' اگرچہ بسا اوقات میرا تجربہ مجھے قنوطیت کے حوالے کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ بہرحال ایسے عظیم راہنماؤں کی فکر

اور نظریئے تو جوہری توانائی کے حامل ہوتے ہیں جو ہزاروں برس تاریک گوشوں کو منور رکھتے ہیں۔ عظیم لاطینی امریکی شاعر پابلو نرودا نے اپنی نظم اسی فکری آواگون کے سلسلے میں تو نہیں کہی تھی جو بھٹو صاحب پر صادق آتی ہے؟

جب میں نیا نیا بیدار ہوا
تو میں نے دن کو پہچان لیا
یہ گزر ہوا کل تھا
ایک اور گزرا ہوا کل، جس کا ایک اور نام تھا
ایک دوست،
جو میری دانست میں مجھ سے بچھڑ گیا تھا
جس نے واپس آکر مجھے حیران کر دیا۔

ڈاکٹر امیر الدین

محترمہ صدر مجلس _ دوستو !

آج یہ بات میں اس فورم کی وساطت سے واضح کرنا چاہوں گا کہ جمہوریت پسند ادیبوں، دانشوروں اور اہل فکر کا تعلق نہ کبھی جاہ و حشم سے رہا ہے، اور نہ اہل اقتدار کی قربت سے۔ ایوب خان سے ضیاء الحق تک اور ضیاء الحق سے لے کر اس کے پالتو رجعت پسند، سرمایہ پرست گماشتوں تک، ہرطاغوتی ہر یذیری، ہر عوام دشمن، لسانی گروہوں Status quo کے علمبرداروں سے ہر دور میں، ہر موڑ پر ہماری جدوجہد تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ یہ اہل علم و دانش کا وہ طبقہ ہے، جو حسن ناصر سے حبیب جالب تک، فیض احمد فیض سے احمد فراز اور فخر زماں تک، ظالموں اور جابروں کو بے نقاب کرتا رہا ہے۔ مجھے کہنے دیں کہ ہم اہل جبر کے نام و نسب سے واقف ہیں۔

خواتین و حضرات ! ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہم نے کبھی ظلم و جبر کے آگے سر نہیں جھکایا۔ ہمیں فخر ہے کہ چمک نے ہمیں کبھی متاثر نہیں کیا۔ ہم نے ہر دور میں پاکستان کے کچلے ہوئے مظلوم طبقات کی نہ صرف حمایت کی، بلکہ اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ ہم اس مملکت خداداد کے مظلوم عوام کے دوستوں اور دشمنوں کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ ہمارے حافظے میں وہ ساری یادیں محفوظ ہیں کہ قیام پاکستان سے آج تک عوام کو اس ملک کے مظلوم عوام کو کس کس طرح سے بے آبرو کیا گیا۔ کن کن حربوں سے عوام کو غربت اور جہالت کے اندھے غار میں دھکیلا گیا۔ 48 سال کے طویل عرصہ میں جب جب روشنی کی کرن رونماء ہوئی، کس کس طرح سے ان شب پرستوں نے روشنی کو عوام سے چھیننا چاہا۔ شوکت اسلام سے لیکر کفر کے فتووں سازشوں جھوٹی اخباری رپورٹوں گمراہ کن اخباری کالموں جھوٹی گواہیوں سے تختہ دار تک، ذوالفقار علی بھٹو کی شہادت ہمارے حافظے میں اسطرح محفوظ ہے جیسے کل ہی کی

بات ہو۔ مجھے کہنے دیں کہ یہ وہ بھیڑیئے ہیں جنکی پیاس انسانی خون سے بجھتی ہے۔ یہ علم و دانش کے دشمن یہ بازی گر آج بنیادی انسانی حقوق اور غریبوں کے سب سے بڑے ہمدردوں کا لبادہ اوڑھ کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ بازی گر ہیں جنکی زبان پر غریبوں کا نام ہے لیکن جنکے دلوں میں عوام دشمنی کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ خون آلودہ ہیں۔ ان کے منہ سے بارود کی بو آتی ہے۔ ان کے خزانے عوام سے لوٹی ہوئی دولت سے بھرے ہوئے ہیں۔ پھر بھی ان کے دلوں میں ہوس زر ہے کہ کم ہونے نہیں پاتی۔ پتہ نہیں کتنے کواپریٹو' کتنے بولان بنک کتنی تاج کمپنیاں کتنی شوگر ملز کتنی فونڈریاں ان کی بھوک مٹا سکیں۔

یہ ملک ان کے لئے مال غنیمت کی حیثیت رکھتا ہے غنڈہ گردی۔پیسے کی ریل پیل اور پیسے کی سیاست ان کا نصب العین ہے

مجھے کہنے دیں کہ۔

ذہن پر خوف کی بنیاد اٹھانے والو
ظلم کی فصل کو کھیتوں میں اگانے والو

گیت کے شہر کو بندوق سے ڈھانے والو
فکر کی راہ میں بارود بچھانے والو

تم تو سکوں کی لپکتی ہوئی جھنکاروں میں
اپنی ماؤں کو لئے آتے ہو بازاروں میں

آج جس موضوع پر اظہار خیال کے لئے میں حاضر ہوا ہوں وہ ایک ایسا خواب ہے جو گذشتہ سالوں میں شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ہر آنے والا سال پاکستان کو جمہوریت' روشن خیالی' عوام دوستی' علم' دانشمندی' وسیع النظری' رواداری اور تہذیت سے دور لے جاتا رہا۔ یہاں تک کہ جمہوریت کو ان آمروں نے اپنی مرضی کے ایک ایسے نظام میں تبدیل کر دیا جو ہمیشہ اہل ثروت اور اہل حکم کے زیر نگیں رہے یعنی عوام کو

بھیڑیوں کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

اس ملک کے عوام اہل فکر اور اس ملک سے محبت کرنے والوں کے خواب کو جس طرح سے مسمار کیا گیا اس کی تاریخ اتنی بھیانک اتنی لرزہ خیز ہے کہ جمہوریت کا نام لیتے ہوئے خوف آنے لگا ہے۔ صدر مجلس۔ جس قدر بے حرمتی جمہوریت کی اس مملکت خداداد میں آمروں کے ہاتھوں ہوئی جس قدر دست درازیاں ان فرمان رواؤں نے جمہوریت کے ساتھ روا رکھیں' جتنا عوام کی عزت نفس کے ساتھ اس ملک میں کھیلا گیا ہے' جس طرح ان کے خوابوں کو چکنا چور کیا گیا ہے' یہ ایک ایسی تاریخ ہے جو درد ناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ جب اہل دانش تاریخ کے اس المیہ پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے آہوں سسکیوں اور اندھیروں کے کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔

صدر مجلس ! میں آپ کی اجازت سے حالات کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کرنا چاہوں گا تاکہ یہ معزز ایوان ملک کی مایوس کن صورتحال کو سمجھ سکے۔ قیام پاکستان کے فوراً" بعد ہی یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی تھی کہ اس مملکت خداداد کے قیام کا مقصد ہی صرف چند جاگیرداروں' انگریز کے کاسہ لیسوں' نوکر شاہی کے گماشتوں' سرمایہ داروں' اور ان کے ایجنٹوں کے نزدیک صرف اور صرف لوٹ کھسوٹ' دولت کے ارتکاز اور کرسی کا حصول کے سوا کچھ نہ تھا۔ پاکستان کی تاریخ کے اولین دس سالوں میں یہ بات عوام الناس نے سمجھ لی تھی کہ ان عوام دشمن قوتوں سے پیچھا چھڑائے بغیر یہ اجالا داغ داغ ہی رہے گا۔ 1958ء میں عوام کے تیور بتا رہے تھے کہ ان ظالموں کے دن گنے جا چکے ہیں اور آنے والے انتخابات میں انہیں ایسی عبرت ناک شکست کا سامنا ہوگا جیسی شکست 1954ء میں مشرقی پاکستان میں ان کا مقدر بنی۔

اس شکست سے بچنے کے لیے ایک شاطرانہ چال کے ذریعے مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ بدعنوان سیاسی قیادت نے فوج کو بدعنوانی کی راہ تو قیام پاکستان کے بعد ہی سے دکھانی شروع کر دی تھی۔ بلکہ فوج کی اعلیٰ قیادت کو اپنا شریک کار بنا چکی تھی۔ اور پھر اسی بدعنوان فوجی قیادت نے اپنے ہی ملک کو بار بار فتح کیا۔

اس پہلے ملک گیر مارشل لاء نے ریاست کی بنیادوں میں دراڑیں ڈال دیں۔ اس مارشل لاء کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ بائیس خاندانوں کو لوٹ کھسوٹ کی مکمل آزادی اور اجازت دے دی گئی۔ اگر کوئی اس لوٹ کھسوٹ کے خلاف آواز بلند کرتا تو شاہی قلعے اور اذیت گاہوں کے دروازے وا کر دیئے جاتے کیونکہ حق گوئی کو ایک ناقابل معافی جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ اس بھیانک اندھیری رات میں ترقی پسند' روشن خیال اور جمہوریت کے علمبردار طلباء نے اپنے خون کے چراغ روشن کئے اور آمرانہ نظام کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اب عوامی رائے کو مسترد کرنے کے لئے نئی نئی چالیں سوچی گئیں۔ بنیادی جمہوریت کا بے بنیاد جال پھیلایا گیا۔ یہ وہ نظام تھا جس کا تانا بانا' دھن' دھونس اور دھاندلی پر بنا گیا۔

مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح تو کیا اگر ایوب خان کے خلاف کوئی پیغمبر بھی الیکشن لڑتا تو ہار جاتا۔ محترمہ فاطمہ جناح کی شکست نے کشمکش کرب و بلا کو شام غریباں میں بدل دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب عوام کو حوصلہ مند اور باہمت قیادت کی ضرورت تھی کیونکہ تحریک پاکستان کے نام نہاد رہنما رعب ایوبی کے آگے سرنگوں اور دربار اپنی جگہ بنانے کے منتظر تھے۔

ان مایوس کن حالات میں' اس آمرانہ اندھیری رات میں ایک مرد قلندر کا نعرہ مستانہ سنائی دیا۔ کراچی سے خیبر تک کے عوام نے اس آواز پر لبیک کہا۔ وہ جہاں جہاں جاتا عوام کا ایک جم غفیر ایک .بپھرا ہوا سمندر اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ ایوانوں میں گویا زلزلہ آگیا۔ یہ کیسی آواز تھی' یہ کیسا راگ تھا جس نے عوام کو ایک نیا ولولہ بخشا؟ مردہ دلوں میں زندگی کی رمق پیدا کر دی۔ قیام پاکستان کے 20 سالوں بعد مفلوک الحال عوام کو محسوس ہوا کہ یہ وطن جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی میراث نہیں بلکہ اس ملک کی حاکمیت عوام کا وہ غضب شدہ حق ہے جو یہ مرد آزاد عوام تک پہنچانے کے لیے آیا ہے۔ عوام دوست دانشوروں باضمیر اخبار نویسوں نے اس ملک سے محبت کرنے والوں عوام کی خوشحالی کا خواب دیکھنے والوں نے اسے صدائے غیبی سمجھ کر اسکا

ساتھ دیا۔ ایک طرف تو ذوالفقار علی بھٹو اپنی جان ہتھیلی پر لئے اس عوامی سیلاب کے ہمراہ جمہوریت کی منزل کی جانب رواں دواں تھے۔ اور دوسری طرف ساحرانہ کاسہ لیس بنیاد پرست علماء سو جاگیردار سرمایہ دار اور ان کے ایجنٹ کفر کے فتوں سے لیس اس سمندر کے آگے بند باندھنے کے منتظر تھے۔ پاکستان کے پہلے آزادنہ انتخابات میں عوام نے اپنا دو ٹوک فیصلہ صادر کر دیا۔ بڑے بڑے بت پاش پاش ہو گئے۔ ایوانوں میں زلزلہ آگیا۔ حشر بپا ہو گیا۔ یہ انتخابات نہیں بلکہ عوام کی امنگوں کا آئینہ دار ایک ایسا انقلاب تھا جو تیسری دنیا کا معجزہ اور ایسی انہونی تھی جس نے ظالموں کو سامراج کے ایجنٹوں کو اور Status quo کے علمبرداروں کو عبرت ناک شکست سے دوچار کیا۔ لیکن جاننے والے جانتے تھے وہ مرد خود آگاہ بھی اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ بھیڑیئے اس کے خون سے اپنی پیاس بجھانے کی تاک میں ہیں۔ ذوالفقار علی بھٹو کے پروانہ موت پر دستخط ثبت ہو چکے تھے صرف وقت کا انتظار تھا اور موت کی یہ سزا خمیازہ تھی مفلوک الحال عوام میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کی' غریب ہاریوں' مزدوروں اور نچلے طبقے کے عوام میں جذبہ عزت نفس بیدار کرنے کی مخالفت کی' محلاتی سازشوں کی بیخ کنی کی' سول اور ملٹری بیوروکریسی کی حاکمیت سے انکار کی۔ اس کی سزا کا تعین تو 1970ء ہی میں ہو چکا تھا اور بھیڑیئے گھات لگائے بیٹھے تھے کہ کب اور کیسے عمل کیا جائے۔

صدر مجلس ۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ ملک کو دو لخت کرنے والی قوتیں الشمس اور البدر کے جانباز کرپٹ اور دیوالیہ سیاست دان سول اور ملٹری بیوروکریسی خود غرض سرمایہ دار اور نام نہاد مذہبی جماعتیں ہم آواز ہو کر ایک ہی راگ الاپنے لگیں کہ بنگلہ دیش کے قیام کا ذمہ دار وہ شخص ہے جس نے آخری لمحے تک اس المیئے کو ظہور پزیر ہونے سے روکے رکھا۔ سقوط مشرقی پاکستان کا تعین تو سالہا سال پہلے یہ طاغوتی قوتیں کر چکیں تھیں۔ میری ناچیز رائے میں بھٹو صاحب کی غلطی ہی یہی تھی کہ وہ بر وقت ان مکروہ چہروں کو بے نقاب نہ کر سکے۔ ان کا قصور ہی یہی تھا کہ وہ بچے کھچے پاکستان کو امن اور اشتی کا گہوارہ بنانے چاہتے تھے۔ ان کی خطا ہی یہی تھی کہ وہ سازشوں اور

قاتلوں کو معاف کردینے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اور یہ حوصلہ یہ اعتماد ایک عام سیاست دان کے ظرف اور بس کی بات نہ تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب بھٹو صاحب کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر عوام ان طاغوتی قوتوں کو تہس نہس کر ڈالتے کیوں کہ اس وقت یہ طاقتیں اتنی کمزور ہو چکیں تھیں کہ اپنا دفاع بھی نہ کر پاتیں۔ لیکن بھٹو صاحب اپنی اعلیٰ ظرفی اور وطن دوستی کی بناء پر وہ سب کچھ نہ کر سکے جو ایک عام سیاست دان کر گزرتا اور اسی ایک موقع کا فائدہ اٹھا کر ان کے خون سے پیاس بجھائی گئی۔

بھٹو صاحب تو ایک فلاسفر ایک شاعر تھے ایک Dreamer تھے' خواب دیکھنے والے' جمہوریت کا خواب امن اور آتشی محبت اور خوشحالی کے خواب۔ وہ ان ہی خوابوں کی تکمیل کے لئے کوشاں تھے۔ تعبیر کی خاطر سرگرداں تھے لیکن وہ قوتیں جو ان خوابوں کی تعبیر کے خیال سے سیخ پا تھیں' وہ قوتیں جو پسپا ہو چکیں تھیں' پھر سے صف آرا ہوئیں انتقام کے لئے۔ یہ کس سے انتقام تھا؟ کیسا انتقام تھا؟ کیا یہ پاکستان سے انتقام تھا؟ اس ملک کے کروڑوں عوام سے انتقام تھا؟ اس ملک کے مستقبل سے انتقام تھا؟

صدر مجلس ! انتہائی منصوبہ بندی کے ساتھ نفسیاتی حربوں اور long term planning کے ساتھ اپنے ہی ملک کے خلاف جنگی منصوبہ بندی کی گئی۔ اپنے عوام کے خلاف اپنے ملک کے خلاف انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ملک کو ایسے اندھیروں میں دھکیلا گیا جس کے منحوس سائے پاکستان کی سیاست پر اب تک چھائے ہوئے ہیں۔

خواتین و حضرات ! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی علم و دانش کی موت تھی' جمہوریت کو مصلوب کرنے کی سازش تھی۔ عوام کی امنگوں' ان کی خوشحالی ان کے خوابوں کی موت تھی۔ جمہوریت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان سے ختم کرنے کی سازش تھی۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جتنا نقصان اس ملک کو ضیاء الحق نے پہنچایا اتنا نقصان تو انگریز امریکہ اور ہندوستان ملکر بھی نہ پہنچا سکے۔ بھٹو

کے جانثاروں اور حامیوں کو دبانے کے لئے جو حربے استعمال کئے گئے ان کے نتائج اتنے بھیانک اور خوفناک ہیں کہ آج ملک کی سالمیت ہی کو خطرہ لاحق ہے۔ لسانی تنظیمیں ہیروئین کلچر کلاشنکوف ثقافت جناح پور' سندھو دیش' جنوبی پشتو نخواہ' ساڈا پنجاب اور پتہ نہیں کتنے فتنے ہیں جو بھٹو فوبیا نے جنم دیئے۔

رشوت اور لوٹ کھسوٹ کو Institutionalize کر دیا گیا۔ انتخابات کو اس قدر رسوا اور بے حرمت کیا گیا کہ ان اداروں پر سے عوام کا اعتماد اٹھنے لگا۔ کیا عوام ایسے انتخابات پر اعتماد کر سکتے تھے جن کے نتائج ایوان صدر میں مرتب ہوئے ہوں؟ کیا ایسی جمہوریت عوام کو اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکتی تھی؟ کیا ایسی جمہوریت عوام کو روٹی' کپڑا اور مکان مہیا کر سکتی تھی؟

مارشل لاء کے گیارہ سالہ دور میں جو ظلم و ستم ہوا وہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کا نام ہی ان جابروں اور ان کے حاشیہ نشینوں کی نیندیں اڑانے کے لئے کافی تھا۔ بھٹو خاندان کو بھٹو کے جانثاروں کو جس جس طرح سے اذیتیں اور ایذائیں پہنچائی گئیں وہ آج کے نام نہاد جمہوریت کے پرستاروں' شریفوں' رشیدوں' دستیگروں' چودھریوں کو اگر اس ٹارچر کا اس ظلم و ستم کا عشر عشیر بھی مل جائے تو وہ سیاست تو کیا اس ملک سے کنارہ کشی اختیار کر لیں۔

خواتین و حضرات ! ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست صرف سیاست نہیں تھی۔ وہ تو ایک عبادت تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوریت وہ جمہوریت نہیں تھی جو ایوانوں اور وزارتوں میں پہنچنے اور دولت جمع کرنے کا ذریعہ ہو۔ وہ جمہوریت تو عوام کی خوشحالی کا خواب تھی۔ ملک کو اندھیروں اور غربت سے نکالنے کی جامع منصوبہ بندی تھی۔ کشمیر' فلسطین اور تیسری دنیا کے عوام کے ساتھ ایک عہد وفا تھی علاج گردش لیل و نہار کا خواب تھی۔ اہل ہوس نے سوداگروں نے اس خواب کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ چکنا چور کر دیا۔ گیارہ سال کے طویل عرصے میں ملک کو ایک ایسے اکھاڑے میں تبدیل کر دیا گیا جس میں جمہوریت بازیگروں کے ہاتھوں میں ایک تماشہ بن کر رہ گئی۔ گیارہ سال کا یہ

عرصہ محرومیوں ناانصافیوں غاصب کی چیرہ دستیوں جمہوریت کے جھوٹے دعویداروں اسلام کے نام نہاد ٹھیکیداروں انسانیت محبت اور شرافت کے قاتلوں اعلیٰ عدالتوں کی بددیانتیوں' سرمایہ داروں' وڈیروں اور سرداروں کی ضمیر فروشیوں' لسانی دہشت گردوں کی سیہ کاریوں کی ایک طویل داستان ہے اور اب یہ داستان تاریخ کا سیاہ باب بن چکی ہے۔

1988ء اور 1993ء کے انتخابات نے ثابت کر دیا کہ عوام اپنے دوستوں اور اپنے دشمنوں کو اخباری کالم نگاروں اور کرائے کے دانشوروں سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ عوام وہی جمہوریت چاہتے ہیں جو ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوریت تھی۔ عوام ذوالفقار علی بھٹو کی بیٹی میں بھٹو شہید کی خواہشوں' امنگوں' ولولوں کی تصویر دیکھتے ہیں۔ عوام بھٹو کی بیٹی سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی بھٹو صاحب سے کرتے تھے۔ عوام چاہتے ہیں کہ عظیم بھٹو کی عظیم بیٹی ایوانوں کی زنجیروں کو توڑ دے۔ ان کے درمیان آئے اور دہشت گردوں' مفاد پرستوں' لیٹروں اور لوٹوں کو بے نقاب کرے۔ عوام خوشامدیوں اور "یس میڈم" اور "سب ٹھیک ہے" کہنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ حقیقت جاننا چاہتے ہیں۔ عوام اسمبلیوں میں ایسے نمائندے چاہتے ہیں جو بے نظیر کے ایک ہلکے سے اشارے پر تاج و تخت کو ٹھوکر مار دیں۔ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے سے گریز نہ کریں۔ وہ ایسے نمائندے چاہتے ہیں جو ان کا دکھ درد سمجھ سکیں۔ یہی ذوالفقار علی بھٹو کی جمہوریت ہے اور یہی پی پی کا منشور بھی۔ اور یہی ظالموں' دہشت گردوں' غنڈوں گردی کے علمبرداروں کا پروانہ موت بھی۔

شکریہ

Justice Dorab Patel

Prime Minister, ladies and gentlemen.

We cannot assess contemporary statesmen because we are affected by their achievements and their mistakes. I suffer from this disqualification because I was Mr. Bhutto's contemporary. Perhaps I suffer from a further disqualification that conservatism is the occupational hazard of the judiciary. But since I have been asked to speak, I would like to say how my generation assesses Mr. Bhutto.

To begin with I shall point out that the provinces which constitute the Pakistan of today were the most backward and the most autocratically governed parts of British India for at least a hundred years. Under the Government of India Act most of the laws were rather arbitrary. But their, under this act, the government, until 1956 was a dictatorship in all but name. The 1956 constitution contained provision about human rights which was a great step forward but it was snuffed out in two years. This was too short a time to change peoples' habits. General Ayub the 1962 constitution was a reactionary constitution though fundamental rights might have changed it. They came in 1964 but they went out again in 1965 because of the emergency. Ayub's period saw a policy of industrialization under which we all thought we were going to become an Asian tiger.

Ayub introduced land reforms, but the green revolution which ultimately benefited agriculture and the villages initially and for a decade increased the poverty of the rural poor. This was the situation we inherited in 1972 and in addition we faced the identity crisis because of the break-up of the country. So very wisely Mr. Bhutto decided to give special attention of the rural population and to labour.

According to Prof. Waseem, Mr. Bhutto's labour legislation increased the wages of labour by about 12 percent. Nobody has referred to his nationalization policy but industrial development slumped after 1971 because we were geared for the East Pakistan market which we were exploiting. It is to Mr. Bhutto's credit that even with nationalization, investment in industry increased enormously. Nationalization failed for other reasons because economic theory changes like fashion in clothes. I am disturbed by the way privatization is being carried on. Privatization creates its own problems, and I think Mr. Bhutto laid down the correct guidelines in prescribing a mixed economy.

Mr. Bhutto's land reforms have been referred to here. They were only the first installment. Therefore, Mr. Bhutto had made sweeping changes in the constitution with regard ownership of property. It had been protected almost by cast iron guarantees. In the previous constitution Mr. Bhutto had curtailed those rights and enacted a provision in Article 24 which nobody seems to have noticed. This article invalidated laws for the acquisition of property acquired by any person by unfair means or in a manner contrary to law. I thought the point came

up in the yellow cab scheme, but it was not examined by the Supreme Court. Mr. Bhutto also amended the constitution to make it impossible to challenge land reforms. Therefore I have not been able to understand the Supreme Court's judgment in which land reforms were declared illegal.

Well, I now turn to the political side of Mr. Bhutto's career and achievements, because political rights are essential for democracy. He began well, because the 1973 constitution lifted all restrictions on the right to form political parties in line with western democracy. Unfortunately, next year the constitution was amended to permit reasonable restrictions to be placed on the right to form political parties. However, we had inherited from 1962 the Political Parties Act which enabled the federal government to dissolve political parties on flimsy grounds. It is to Mr. Bhutto's credit that he changed that law and drastically curtailed the grounds on which the federal government namely his own government would dissolve political parties. Unfortunately the legislation was nullified once again by a judgment of the Supreme Court.

Now I turn to Mr. Bhutto's debit side. Throughout the period of his prime minister-ship lie kept the emergency in force so that fundamental rights were not available, except for an interval too short to matter. This was a great mistake in my opinion. However, there is a personal incident to which I would refer. Ayub's Press and Publication Ordinance did not have teeth, but newspapers were afraid of it because of the three second world wars case lawn the meaning of situation. However two Sindhi newspapers gave the challenge. Their licenses to print were confiscated by the government of Sindh. So they came to us in the High Court. We allowed the petition and nullified Sindh government's orders. The Sindh government filed an appeal, because Mr. Bhutto had been abused in very offensive language. I am of the view that the criticism was unjust, but it was a question of the freedom of the press and we allowed the petition. So our judgment became the law, and the press got, in my opinion, the same freedom as it would have if fundamental rights and freedom of the press had existed.

Well I think. You have heard quite a number of speeches. When I joined the bench, I was told that the duty of judges is to listen rather than talk. So I follow that advice, but I will say just one word more. Democracy consists of political, social, and economic rights and Mr. Bhutto had made a great contribution to economic and social rights. Sadly, society forgot the work he had done for the emancipation of women. Maybe that was his greatest legacy to us. So it would be in the fitness of things if we can carry his legacy forward. If the government ratifies the international covenant of 1966 on economic social, and cultural rights, and I also hope the government will ratify the international covenant on civil and political rights it would be good because in the new age in which we live that would be carrying democracy further.

Thank you.

==========

Dr. Aslam Syed

Thank you Mr. Fakhar Zaman for generous introduction.

Madam Prime Minister, honorable guest, ladies and gentlemen.

A fair evaluation of Zulfikar Aki Bhutto's contribution to democracy is possible only when we juxtapose the odds against which he had to work; only when we realize how much dust of authoritarianism and oppression he had to clear from the goddess of democracy and only when we see hint as an integral part of our history and our consciousness. Add to this, the dialectical process of history where encounters between conflicting legacies take place, and where the leaders and the masses indirect with each other some times as fore-runners of a new tradition and some tunes as inheritors of the legacies of history Bhutto's legacy in general and his contribution to democracy in particular rests on that very foundation which made the establishment of Pakistan possible going to the masses not just for their votes but to articulate their inner feeling, to give voice to their muffled aspirations and to activate their passive behavior. His youthful eyes witnessed the dawn of freedom. The formative phase of his political career saw the drama of political intrigue of the 50s and his receptive mind absorbed the pangs of the 60s. He saw how this nation was robbed of its collective destiny, through the disparaging behavior of his myopic politicians, self styled reformers with bloated egos. He knew that this nation could achieve what its manifest destiny had aimed at only when the colonial baggage would be unburdened and only when the leaders will march with the people towards their common destination. A keen observer of international politics, a serious student of history and a part of the same social and political milieu, he had to wrestle with this three dimensional legacy in order to strengthen democracy long before he lodged his owns political party. He had realized that agrarian society: can not enter into the orbit of democracy unless visible deuts are made in their social and economic structure. He was instrumental in implementing the first land reforms in this country and promotion of science and technology and giving a new direction to our foreign: policy and discarding the colonial pattern and in identifying our destiny with China and other Afro-Asian countries.

When he decided to launch his political party punlike others in this field, he sought new alignments, alignment with those who had suffered at the hands of feudalism, bureaucracy and mullaism. It was they working class, the students, the peasants and the neglected middle class that he approached. He talked to the people in the language that they understood in the idiom that was familiar to them and with an emphasize that awakened them from deep slumber of unfulfilled desires. His pledge to give people "Roti", "Kapra" and "makan" was not antithetical to any value system but on the contrary the foundation on which

higher values are built and without which no ideology can survive or sustain itself. This is where Bhutto and democracy become identical. Political scientists and historian agree that democracy rests on certain pre-requisites. The most important of these are institutions which guarantee wider political participation, identification of peoples' aspirations, ensuring economic and social justice transition of agrarian communities into industrial politics, emancipation from any pre-conceived or determined paradigms. In the light of this framework, let us analysis the contribution of Bhutto to democracy. The first and the foremost contribution of Bhutto was in rehabilitating the confidence of his nation in its destiny and future.

The crisis of 1971 was not an ordinary phenomenon. History is replete with examples when such moments have been used in perpetuating dictatorships under the rubrie of emergency laws. Bhutto not only collected the broken pieces of our pride but also stabilized the boat that had been rocked by the events of 1971. He went back to the pages of our history and gave us that no other political leader could give and which even the succeeding black era of dictatorship could not snatch from us. This was the constitution of 1973. What the nation could not achieve in nine years after independence when there were on scars of secession, he gave us in one year. The constitution of 1973 was the greatest gift of Bhutto to democracy in Pakistan. So far as his identification with the peoples' aspirations was concern, ask any worker, ask any artist, any peasant, any student, any intellectual, how closer he came to represent them. He shared every joy and sorrow with them so much so that he even did not hesitate to separate the Prime Minister Bhutto from the citizen Bhutto in voicing the grievances of the people against his own government in ensuring social and economic justice. He made no distinction between street peddlar and a capitalist, between a feudal lord and a peasant, between a worker and a factory owner. The steps he took in this direction were enormous and cannot be possibly enumerated in this short time, yet when their we talk about women status or university charters, fundamental rights or revenue legislation, students organization or labour unious, a poor man's hut or a feudal lord mansion, a bureaucrat's chair or the folded rug of a cobbler, nothing escaped his vision.

He took away the sting of the capitalist and the whip of the feudal lord. He gave dignity to common': man and pride to the wretched. This change in itself is an ever-lasting testimony of his contribution to democracy. He worked very hard to bring about a transition in our society through legislation, through mass contacts, through his speeches and statements. He honored the artist, poets and intellectuals of this country because he believed that creativity and imagination go a long way in emancipating people because a nation cannot claim to be independent unless its people are free to leave their imprints on its soil. During his premiership he earned another distention of being the only sitting Prime Minister in Pakistan who held elections despite the fact that he was comfortably settled in power chronologically. Bhutto's period is covers only five years but

both qualitatively and quantitatively what democracy received form him in this period is far too much. He attempted to change the legacy of a quarter of a century of authoritarianism and oppression in independent Pakistan. When I compare five years of his democratic rule with the succeeding Martial Law and dictatorship of eleven years, it seems that perhaps he had burnt so much dead wood at the altar of democracy that the nation was enveloped in clouds of dark smoke for eleven year. But when the smoke was clear the ashes revealed the death of dictatorship and the down of Bhutto's Heritage was as bright as youthful exuberance its author. This is the dialectics of history where tussle between democracy and dictatorship continues but journey towards freedom from oppression never stops. Feudalism as a physical irritant to democracy is almost dead but its behavioral overtones still lurk behind our trail. Bureaucracy is still a formidable force and religious fanaticism and intolerance is still chasing us. The only force that can remove these hurdles is democracy. Now Bhutto's legacy is on Bhutto's shoulders. His intellectual legacy is safely housed in her vision and his dream of a sovereign and powerful Pakistan, a Pakistan that is reflective of the "Quaid's visions, Pakistan that truly portrays our Islamic heritage, a Pakistan which could be pride for our posterity awaits fulfillments at her hands. Let us strengthen her hands, give her support and let us do it irrespective of our political affiliations because democracy is our origin, democracy is our destiny and today's democratic Pakistan owes much to Bhutto's legacy and if you look at from the perspective of our history, it is as much a matter of pride for Pakistan Peoples Party as any other political organization in this country. There was no room of this sort of political activity and this degree of freedom of expression which permeates of our political system today in pre-Bhutto Pakistan and the trail that he left behind was so over-whelming and so ever-lasting that even the eleven years of deliberate efforts to curb his legacy to down grade his contribution ended in the smoke. It is because of his contribution to democracy that even those who did not believe in polls see them as the ultimate litmus test of their political activities.

Democracy is neither a fixed stage in history nor a neatly packed gift that is delivered to nations, it is a continuous process, a behavior, a culture that rests on the honour given to the verdict of the people.

Thank you.

==========

Abdullah Hussein

Prime Minister, ladies and gentlemen.

I must apologize at the outset for not reading an historical paper. I would like to say a few words about Zulfikar Ali Bhutto and democracy in the most simple of

terms, because he was one man in the history of this nation who brought democracy to the most simple, the most poor, and the most downtrodden people of this country. I should relate two incidents of which I have personal experience. These may appear quite irrelevant to you, but they are symptomatic of the ground-level democracy that Mr. Bhutto brought to this country.

The first incident was when Mr. Bhutto, even before he became Prime Minister, was addressing a "Jalsa", and as he appeared on the stage, people started clapping. The man standing next to me said to me, "you know how people used to clap before?" I struck one palm upon the other and said, "like this" "No, no," he said, "you are wrong. I tell you how they used to clap before. When a great man appeared on the scene or passed by, people clapped shyly. The great man would lift his arm and give a wave of the hand and thus acknowledge the applause. Mr. Bhutto does not do that. When we clap for him, he claps for us in return. You know what that means?" I said no, I didn't know what that means. The man said quietly, "Mr. Bhutto has taught us how to clap." This was an ordinary man, little educated, a man of the street, but what he said to me that day made me understand for the first time what democracy really means on the ground.

Democracy has may faces. One of them is courage. The second incidence was also when Mr. Bhutto was addressing a "Jalsa" in Balochistan. There was a large crowd of men on one side, and on the other side sat the women. At the spur of the moment, Mr. Bhutto called out to the women, "My mother, sisters, daughters, why are you sitting, on one side? Come and sit here with everybody else. You are Human Beings." And the women, without a moment's pause, broke out of their enclosure and came and sat right in front of the men by the stage. And that was in Balochistan. Mr. Bhutto well knew that in a place like that, a gesture such as that could easily earn him a bullet from the crowd. But that was courage. Before he was hanged --- I am sorry, I will say that again --- before he was Murdered, by a decision that has earned everlasting contempt from world judiciary, the fact remains that long before he went, Mr. Bhutto put his neck on the line for the sake of democracy.

Right up to the last, Mr. Bhutto never flinched in the face of almost unbearable pressures. In the end, nothing became him so well as the manner of his going. And I think that is sufficient for us to remember him by.

Finally, allow me to say one last thing. It is said that a murder file is never closed. The file of this particular murder must never close. It is not a question of party politics. In the final analysis, it is a question of justice, and without justice no civilization can ever survive, let alone democracy. A great, a stupendous miscarriage of justice took place fifteen years ago, and until it is reversed, until justice is seen to be done, until the honour of Mr. Bhutto is restored in the annals of judicial history, the cry from the lips of Bhutto's people shall always rise "Jeeway Bhutto". For it is not merely a slogan. It is the demand of the quality of

democracy that Zulfikar Ali Bhutto brought to the people of this country.

M. Iqbal Tajik

Zulfikar Ali Bhutto: on Education

A writer, guy J. Pauker, wrote at the height of the cold war:....."In contrast the Middle East, Southeast Asia, Tropical Africa and Latin America are apt to remain power vacuum during this period, owing to their lack of unity, political instability, economic stagnation and cultural heterogeneity".

This is the picture painted of that part of the world which in common parlance is called the Third Word. The Third World is composed largely of ex-colonial, economically less developed countries. Even decades after their independence they are coping with colonial legacy of poverty, illiteracy, disease and population explosion.

The most vital question facing these countries even today is whether they can develop themselves economically. In other words: will their economic progress surpass the population growth?

Pakistan also belongs to the Third Word. When, in early 70's, Zulfikar Ali Bhutto took over the reins of authority in Pakistan, the country faced not only the common Third World problems mentioned above but it also had to be salvaged from the trauma of the reckless war which disintegrated the country and resulted in the creation of Bangladesh. The morale of the people had to be boosted. It was, no doubt, a Herculean task. Bhutto did accept the challenge.

He analyzed the whole situation and came to the final conclusion that the problems facing the country had to be tackled on two fronts: economic and political.

On the economic front he initiated a number of reforms--- agrarian, industrial etc. In order to boost agricultural economy he introduced a scheme of fixing ceiling to the landed property and the distribution of land among the landless peasants. This step of Bhutto was contrary to what had been done by other leaders of the Third World. There the leaders considered industrialization at the expense of agriculture as a means to modernization thereby completely ignoring the agricultural sector and compounding the agricultural problem. In contrast, Bhutto, though convinced of industrialization as an important means to modernization, did not ignore the importance of agriculture. For most Third World countries agriculture remained the symbol of their colonial status and their backwardness.

Bhutto also took steps towards industrialization. He, while addressing the business and industrial community at Karachi, said: …. "in the previous regimes

industrialization went on without any rational framework ... without any social context .... any egalitarian context ... we have to go in accordance with the requirements of modern times".

He also announced his labour policy ameliorate the lot of the working class.

On the political front his mind was engrossed with bringing stability through cautious democratic means. In a plural society that Pakistan was bringing social homogeneity and political consensus regarded as pre-requisites for, or factors strongly conducive to, stable democracy was, if not impossible, at least, very difficult. Bhutto was not to be daunted. Since he himself had been trained and learned in western style, he desired to organize political institutions on the same pattern. So his first act in this direction was to have a constitution which, in the history of this country, so far, is the only consensus political document.

Bhutto had in mind the translation into reality in Pakistan of a democracy which would be consociational. He had already been very successful in arousing political consciousness among the illiterate masses who had given a very mature judgment/verdict in December 1970 elections. The same masses now under his leadership questioned the validity of actions of those in power. The trend, not bad, did contain the seeds of chaos and confusion. They had to be disciplined. Bhutto did approve of this trend. He relished such ideas; but at the same time he also knew that a country with the literacy rate of not more than 10% could hardly be considered safe for democracy. No doubt he was committed to peoples' rule, he was also conscious of the safeguards for the purpose.

Bhutto was not only an idealist but also a realist. He very well remembered the worlds of Empress Katherine of Russia which she spoke in response to the proposed governmental reforms of the philosopher Diderot: "Ah, my dear friend, you write upon paper, the smooth surface of which presents no obstacle to your pen. But I, poor Empress that I am, must write on the skins of my subjects which are sensitive and ticklish to an extraordinary degree".

Bhutto also knew very well that: "before there can be action, however, there must be decision; before decision, a choice among alternative values; before choice, deliberation; before deliberation, knowledge".

And this quest for knowledge provided him with some relief for the disciplining of the otherwise ignorant masses. He did not agree to the famous saying of Rousseau that "man is born free, yet everywhere he is in chains". Bhutto, rather, believed that "man are born helpless but everywhere they have the capacity to become free". Bhutto knew that this capacity could be increased but that needed time and he did neither have time nor patience. For this purpose he made use of his martial law authority. To his critics once he said: "will the new self-professed mentors of democracy, who readily call for the immediate lifting of Martial Law, show us how simultaneously to lift the masses from their morass of miseries and

injustice?....the power of martial law have been used ... for the sole purpose of bringing ... basic reforms ... once this phase of reforms is over .... the ground would be laid for the full flowering of democracy".

Bhutto desired the uplift of masses socially as well as economically. But at the same time he had in his mind the laying of firm foundation for a democratic setup without which all his efforts would be meaningless. This firm foundation for him was a sound system of education for Pakistan.

The term education has many meanings. Narrowly used it refers to formal education in schools and colleges and established institution. But in reality the term is broader including the shaping of men's minds and attitudes by informal as well as by formal means. Based upon this interpretation of the term, education can be an extremely potent force in domestic politics.

Being adept in world history and politics Bhutto was aware of the fact that during the post Word War II period education for citizens had become the motif of much educational reform and a whole new body of pedagogical literature on education made its appearance. He also knew that educational progress and achievement, particularly in technical and professional fields, were recognised as indices of national prestige, elements in the power potential of modern states.

Bhutto was also aware of the that the origin of modern education system lay largely in the national and industrial and democratic movements that ushered in modern times; educational purposes and habits and institutions have been and are intimately and peculiarly related to the spirit of nationalism and to nation states. Modern education systems were born under the aegis of national movements, were cradled in national structures, took forms harmonious with national cultures and became primary agents for the perpetuation of national characteristics.

Bhutto was very much clear on the point that the intimate relation between education and nationality appears not only in the formal system of schools and colleges that have grown up within nations but also ink the informal modes and mores of education, both in, childhood and in adulthood. He also knew that some-educational systems were highly centralized on at national basis, while others had a large degree of local, autonomy. There were educational systems that reached to elite, whereas other stamps their mark on virtually the entire population.

Bhutto knew that in some cultures education in the formal sense tended to be an escape into an ivory tower ... or a bomb tower ... whereas in others education tries to build a new social order in the mould of the predominant national spirit. In some countries educational institutions are primarily concerned with the development of talents, intellectual, and aesthetic within favored individuals; in others, emphasis is placed upon development of civic outlook, of social

sensitivity and responsibility among large group of young citizens.

Bhutto had witnessed that the rise and expansion of adult educational movements in various parts of the world had been phenomenal. He knew that these movements were of particular consequence to an analysis of the relationship of education to social and, civic attitudes among citizens and to the formation of public opinion on current issues.

He was also convinced that in democratic societies a high level of education was essential for national welfare and that education system added both prestige and effectiveness to nations; and lack of education was regarded as a handicap. He was of the view that education contributes to nation's strength, particularly as that strength has come to be measured in scientific, economic, ideological, and logistic terms. Education had an increasingly close relation to national policy, whether of define or of the definition of peace. It is an essential element in the development of underdeveloped countries. For Bhutto education was a factor in national power.

Bhutto, however, was on the horns of a dilemma. He had before him two educational models: one emphasizing education as a right and the other advocating education as a privilege. He as a member of the traditional elitist group in the country did believe that education was a privilege. But as a popular leader .... one who had been successful in rousing the masses from the deep political slumber ... knew that mass education was essential and it was here that he recognised education as a right.

After a great deal of brainstorming he was able to architect a system of education that would be a happy blending of both the models.

Bhutto, as pointed earlier, was convinced of the fact that industrialization was both essential for modernization and political stability. For this purpose he devised a system which he would implement phase wise. He had the desire to make education up to secondary level free and compulsory. It is here that he recognised education as an inalienable right of the down-trodden masses of Pakistan. But he totally rejected the prevalent system of school education in the public sector which produced semi-literate and half backed citizens absolutely unfit for any purpose in the; nation-building task. He also considered the whole exercise as futile and sheer waste of time, money and energy of the nation.

In order to make it more useful, Bhutto, first of all wanted to eliminate discriminatory systems that functioned at the lower tier of the educational edifice., There were two parallel school systems (as are today) in operation till the seventies. One was modeled on the western public school lines to produce the elitist class and the other was the one being run in the public sector, the so-called government schools, geared to produce Babus.

So Bhutto took the first bold step to eliminate this discrimination. He issued orders for the nationalization of all schools in the private sector. This was the right step at the right time and in the right direction. It was in this field that Bhutto appeared in his true Awami colours. This step was warmly welcomed by all and sundry, of course, not by the privileged and the traditional elite.

Bhutto, as mentioned earlier, rejected the prevalent school system. He had more useful and purposeful ideas. He knew it was difficult to survive without industrialization. He had before him the example of Japan ... the only nation in the present century to become an industrial and economic giant without military might.

So, while recognizing education as a right of the citizen, he also had in his mind the imposition of a duty on them. This he wanted to do by making school education to a great extent vocational and trade oriented. This, according to his thinking, would serve a double purpose: one, it would allow the country to utilize the manpower which under this scheme would definitely be skilled and would accelerate the process and pace of industrialization and, in turn, modernization; and, secondly, it would also bring down the rate of unemployment and reduce the pressure on government ... the biggest employer. These trained, skilled and educated people could open up their own small industrial units. Since the government had already nationalized major industries, these smaller units could supplement and complement them just as had been done in case of some of the far eastern countries. This would, as he thought, and rightly so, augment the process of self-reliance, self-confidence and economic well-being among common masses who according to the PPP manifesto, were the source of political authority and power. This, in turn, would also become a contributory factor in establishing the political system and democratic set-up in the country which had been suffering from this malaise for decades.

For this purpose and as a first step he embarked upon a policy of establishing polytechnic institutions and technical and vocational schools both for male and females. This aspect of the new education policy was given top priority. Now after about two decades the government has realized the importance of primary education and under the aegis of World Bank funds have been provided to make education at this level more purposeful and directional. Still the whole exercise lacks the basis and fundamentals that Bhutto had in mind. Present government would be honoring Bhutto if a serious attention is paid to the fixing of the goals and purposes for primary education that Bhutto had fixed.

So far as higher education was concerned Bhutto appeared to be a true elite, for here he flatly refused to recognize education as a right. Higher education for him was a privilege based, not on birth, status or position in the social scale of the traditional societies, but only on merit and merit alone. Here he desired to apply the principle of selectivity.

He believed in democratization of higher seats of learning. So, as a first step in this direction, he framed the University Act which, like the constitution of Pakistan, has been completely distorted by the Marshal Law regime. It was, I believe, for the first time in the history of the country those steps were taken in earnest to streamline the working of the seats of higher learning. Care was taken to lay emphasis on the quality as well.

Under the new Act steps were taken to make the Universities autonomous. For the first time the teachers were given share in the governance of a University. Elective components were inducted in almost all the organ of the University viz. the syndicate, senate, Academic Council, Finance and Planning Committee, Selection Board, etc. The teacher was recognized as the chief architect of the Academic.

Bhutto didn't ignore the importance of the students; he considered them to be another important component of the Universities. To channel their energies and to train them for higher national purposes he introduced the Student's Union system in the Universities and also gave them representation in the most important organ of a University, i.e., the Syndicate. The present government has been in power now for just over a year yet no step has been taken to revive the Student Union system. Rather it has issued directives to the Universities to impose restrictions on the students by making them sign undertakings and even to expel them in the light of the so called decision of the Supreme Court. What a contrast!

Bhutto knew that all the Universities were funded by the government so he suggested measures which would not hamper the free growth of these institutions. To keep the Universities away from the bureaucratic tinkering, the University Grants Commission was created whose basic task was to receive funds from the government and disburse them among the Universities. Today the UGC has also become a white elephant with the budget of its own which would be sufficient to finance at least two universities.

Under the new Act the Universities were to be free to utilize these funds. They were given freedom and autonomy to frame their own rules, regulations, curricula, policy etc. In order to prevent the Universities from stagnation the principle of tripartite mobilization of staff was also introduced.

According to this principle anybody from one university could be transferred to any other university or to a government department and vice versa. (There was a great protest from the teaching community over this provision of the Act on the ground that it would be arbitrarily used against anti-establishment elements. So the government pledged not to invoke it, although the same remains a part of the university Act all over the country even today).

To better the quality of teaching and the teacher scholarships were made

available for going abroad. Before the Bhutto era, very few scholarships from the socialists countries were availed. This was largely due to our entanglement with the west. During Bhutto's time such opportunities were availed with the result that many scientists and engineers got training and exposure in the socialist block.

In order to make Universities play their role in nation building, teachers were inducted into government departments specially finance, economic and foreign affairs. Many teachers were inducted into the Foreign Ministry through a novel method of lateral entry which was very much resented to by the CSP officers.

Besides, to assist the Foreign office with expert opinion and specialized knowledge, Area Study Centers were established in many universities. These were supposed to function as the think tanks. But today these Centers have become employment exchanges with huge funds being frittered away uselessly and aimlessly. Similarly the Centers of Excellence were created for advanced researches in scientific and technical fields. Even the functioning and performance of these Centers leave much to be desired. The better solution for stopping the waste of funds is to merge them with the universities where they are functioning.

Bhutto is even said to have gone to the extent of giving powers to each University to establish links with other Universities in the world; but this could not materialize due to bureaucratic and diplomatic complications, although in very few cases at a later stage these linkage programmes did materialize.

Bhutto was deadly against discrimination on the basis of sex especially in the field of education. I think, it was for the first time in this country during his tenure as a Prime Minister that a lady was appointed as the Vice Chancellor of a premier seat of learning. This has not happened since despite the fact that Ms. Benazir has been the Prime Minister now for the second time.

One factor that Bhutto rightfully felt a serious stumbling block and an obstacle in the way of progress and development was bigotry. He desired to develop an educational system with secular, liberal and democratic outlook. Today we are facing religious fanaticism, intolerance, violence and undemocratic practices because the seats of learning were polluted with extremism of all sorts during the dark period of Martial Law and unless we return to secularism, liberalism and democracy in educational system, we will continue to grope in the darkness.

One word of caution: recently an exercise was undertaken to streamline higher education and scientific research in collaboration with the World Bank. Three group studies were made and reports compiled. Many revolutionary measures have been suggested and recommended by the study groups specially in the existing structures of the Universities in Pakistan. I don't know whether these reports have been sent to the government. If the government has received them, I would earnestly urge, Madam Prime Minister, to accept the same without any

bureaucratic entanglement as, I feel, these proposals come very close to Bhutto's dream of true autonomous and forward looking Universities.

At the moment the Universities in the Public Sector have become orphanages and haven for the incompetent and inefficient. Most of the Vice Chancellors have been appointed not on merit or ability but only on the basis of links, *biradari* and other relations. The result is that they have created rifts among the staff which has adversely affected academics on the campuses. The proposals now submitted and as envisaged by Bhutto are aimed at providing cure to these maladies.

In conclusion I would say: Bhutto's concept of education is actually a faith in man, in his capacity to liberate himself and to realize his potentialities. It is a system of education which would combine thought and feeling centered upon man, his growth, integrity, dignity, freedom; upon man as an end in himself, and not as a means towards anything; upon his capacity to be active not only as an individual but as a participant in history; and upon the fact that every man carries within himself all of humanity.

==========

Z.A. Jalbani

Z.A. Bhutto and his Aesthetic Sense

Born to beautiful parents, Zulfikar Ali Bhutto was perhaps the most handsome man in the history of mankind to walk to the gallows in the Socratic tradition. The difficult thing for him was not to escape death but to avoid dishonor, because dishonor runs more swiftly than death.

Not every beautiful person is born with an aesthetic sense, but Zulfikar Ali was a singular example of a beautiful man born with a unique aesthetic sense which transcended even his death. In his dying moments he would not forget to shave so as to appear beautiful after death.

He was man of refined and discriminating tastes, fine polished manners, with a subtle sense of humor and fastidious and immaculate in dress. A connoisseur of good books and the finest Havana cigars he was an admirer and collector of exquisite articles. He would annually host regal hunts and entertain his guests with finest feasts. His sense of the artistic knew no bounds and was not restricted to his house, his estate or his home town. It was radiant, vibrant and transforming. Politics for him was not only a profession of the privileged class for him; it was a means to spread and translate his cultural ideas. He transformed every ugly object that came his way and anything at a wrong spot was anathema for him and he pledged to put it at the right place.

Nature had been generous to him in many ways and had gifted him with multiple facilities. One such faculty was his intense intuition. Once at the pinnacle of power, this faculty always reminded him of the very thin time at his disposal, and in his search for love and beauty he wanted to grasp excellence and erase every ugly object. His hurriedness can best be explained by his attempt to achieve eternity in an hour.

> To see a world in a grain of sand
> and heaven in a wild flower;
> Hold infinity in the palm of your hand
> and eternity in an hour.

Ugliness had multiple faces for Zulfikar Ali Bhutto Poverty, hunger, disease and the sufferings of the masses appeared to him objects of the ugliness and were, repugnant to his aesthetic sense. Indifference was the only emotion that he never evoked. Public response to his personality was always astounding, and, in his bid to remove ugliness he earned the hostility of elements who could only thrive and, survive in dirt and filth. When the dust finally settled, his political thoughts and actions came to be endorsed by the intellectual elite. This endorsement was greater after his death which has been proved by the fact that he has many more followers now than in his life time. Bhutto has come to be an eloquent spirit of his times in the final verdict of history.

Zulfikar Ali Bhutto abhorred, despised and hated ugliness. His photographic eye always picked and selected the best and most talented persons for his team. The only time he faulted in his choice was when he picked an ugly man as his courtier, and that proved to be a fatal flaw. A Shakespearian tragedy reproduced itself in the twentieth century. The inevitable eternal conflict between beauty and ugliness ensued. Although he was physically eliminated, he left behind many marks as manifestation of his unique aesthetic sense. More than anything else his search for love and beauty survives in Benazir.

THE END